ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں میں شخصی تلمیحات کا فکری پہلو

ڈاکٹر زینب شاہ لیکچرار اردو، محکمہ اعلی تعلیم خیبر پختونخوا

مس روبینہ مشال ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو، محکمہ اعلی تعلیم خیبر پختونخوا

ڈاکٹر فاطمہ حیات اسسٹنٹ پروفیسر محکمہ اعلی تعلیم خیبر پختونخوا

Abstract:

This article explores the unique approach of Dr. Wazir Agha in incorporating personal allusions in his essays, showcasing his distinctive perspective on life and creativity. Unlike traditional methods, Agha uses historical and philosophical figures not merely as static references but as dynamic bridges connecting the past, present, and future. His essays emphasize that true meaning in life lies not in stillness or nostalgia but in the pursuit of new experiences and continuous exploration. By invoking personalities like Socrates and Rousseau, Agha inspires readers to reflect on life's deeper dimensions, encouraging a mindset of curiosity and intellectual growth. This study highlights how Agha's innovative use of allusions enriches his literary style and provides a timeless invitation to engage with life's ever-evolving landscape.

Keywords: Wazir Agha, personal allusions, Literary Essay, Creative, life's deeper dimensions, intellectual growth.

کلیدی الفاظ: ڈاکٹر وزیر آغا، شخصی تلمیحات، تخلیقی نثر، زندگی کا فلسفہ، حرکت وجدت، تاریخی حوالے، جدید ادبی فکر

عربی زبان کا لفظ "تلمیح" اشارہ، کھوج لگانا، یا کسی امر کا مخفی تذکرہ کرنا ہے۔ صنعتِ تلمیح اردو اور فارسی شاعری کی ایک اہم اور دلکش صنعت ہے جس میں شاعر یا نثر نگار کسی تاریخی، مذہبی، یا ادبی واقعے، شخصیت یا داستان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ تلمیح کا مطلب "اشارہ کرنا" یا "یاد دلانا" ہے، اور اس کا مقصد قاری کو کچھ خاص واقعات یا موضوعات کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے جن سے وہ پہلے ہی واقف ہو۔ اس صنعت کا استعمال تحریر میں گہرائی، دلکشی اور معنویت پیدا کرتا ہے۔ ادبی اصطلاح میں تلمیح اس وقت وجود میں آتی ہے جب شاعر یا نثر نگار اپنے کلام میں کسی معروف داستان، قرآنی واقعہ، حدیث، اساطیری کہانی یا تاریخی شخصیت کی طرف بغیر تفصیل کے اشارہ کرتا ہے۔ یہ اشارہ عموماً مختصر اور جامع ہوتا ہے، لیکن قاری یا سامع کے ذہن میں فوراً ایک وسیع منظر یا مفہوم پیدا کرتا ہے۔ اس صنعت کے ذریعے شاعر یا ادیب اپنے کلام کو زیادہ پُر تاثر، معنی خیز اور جامع بناتا ہے۔ صنعتِ تلمیح کا بنیادی مقصد قاری یا سامع کے علم اور تجربے کو کلام میں شامل کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر شاعر کسی داستانِ لیلیٰ و مجنوں یا کربلا کے واقعات کی طرف اشارہ کرے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سامع پہلے سے ان واقعات کی تفصیلات سے واقف ہے اور شاعر صرف ایک اشارے سے اپنے کلام کو وسیع تر مفہوم عطا کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ، تلمیح کا استعمال مذہبی متون میں بھی عام ہے، جیسے قرآنِ کریم کے واقعات یا اسلامی تاریخ کی اہم شخصیات کی طرف اشارہ مقصود ہو۔۔ سید محمد شمیم انہونوی کے بقول

"تلمیح سے ایام جاہلیت کی زندگی کا نمونہ معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح تاریخی

حالات و واقعات کو محفوظ رکھنے کی آرزو کلام شعرا کے پردے میں چھپا کر پوری کی گئی تھی۔

تاریخ کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو تلمیح کی صفت حروف و الفاظ دنیا کے وجود میں آنے سے

ہزار ہا سال پہلے بھی موجود تھی اور بلا خوف تردید دنیائے ادب میں یہ قدیم صفت کہی جا سکتی ہے"[1]

صنعتِ تلمیح کی ابتدا قدیم ادب میں کہانیوں، روایات، اور مذہبی متون کے ذریعے ہوئی۔ مختلف تہذیبوں میں انسان ہمیشہ سے کہانیوں اور علامتی اظہار کے ذریعے اپنی بات دوسروں تک پہنچاتا رہا ہے۔ تلمیح کا آغاز بنیادی طور پر قدیم مذہبی اور اساطیری متون میں نظر آتا ہے، جہاں واقعات یا شخصیات کا ذکر مختصر انداز میں کیا جاتا تھا، کیونکہ سامعین ان سے پہلے ہی واقف ہوتے تھے۔ مثلاً، قدیم یونانی اور رومی ادب میں دیومالائی کہانیوں اور دیوی دیوتاؤں کی طرف اشارے عام تھے۔ اسی طرح، سنسکرت ادب میں مہابھارت اور رامائن کی کہانیوں کی طرف اشارہ کیا جاتا تھا۔ عربی ادب میں تلمیح کا آغاز شاعری سے ہوا، جہاں شعرا نے تاریخ، قبائلی روایات، اور مذہبی واقعات کو اپنے کلام میں مختصر انداز میں بیان کیا۔ اسلامی ادب میں تلمیح کو خاص اہمیت حاصل ہوئی، کیونکہ قرآنِ کریم اور احادیث میں موجود واقعات اور قصص مختصر اور جامع انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ طرزِ بیان شعرا اور ادبا کے لیے متاثر کن ثابت ہوا، جنہوں نے اسے اپنے کلام میں شامل کیا۔ اردو اور فارسی ادب میں صنعتِ تلمیح کا فروغ خاص طور پر فارسی شعرا جیسے فردوسی، سعدی، اور حافظ کے کلام میں نظر آتا ہے، جنہوں نے قرآنی واقعات، اسلامی تاریخ، اور مشہور کہانیوں کو اپنے اشعار میں شامل کیا۔ انسانی تہذیب کے اولین ادوار میں جہاں انسانی ترقی اور الفاظ ایجاد ہونے لگے، مختلف علامتوں کے لیے اشارہ وضع ہوئے، البتہ ان اشاروں کو موجودہ تلمیح کی صورت نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ قدیم دور میں جب زبان کی ابتدا ہوئی اور انسان اشاروں اور علامات کے ذریعے گفتگو کرتا تھا، تو اسے براہِ راست تلمیح نہیں کہا جا سکتا، لیکن اس میں تلمیح جیسی خصوصیات ضرور موجود تھیں۔ اشاروں اور علامات کے ذریعے انسان ایک وسیع تصور یا مفہوم کو مختصر انداز میں دوسروں تک پہنچاتا تھا، جو تلمیح کی بنیادی خاصیت ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ کوئی بات یا اشارہ سامعین کو کسی معروف واقعے، داستان، یا تصور کی یاد دلائے۔ قدیم دور میں، جب انسان نے ابتدائی علامات، تصویری زبان، اور اشاروں کو تخلیق کیا، تو وہ مخصوص خیالات یا واقعات کو مختصر انداز میں دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن تلمیح کے لیے ایک اہم شرط یہ ہے کہ اشارہ کسی معروف یا مشترکہ علمی پس منظر پر مبنی ہو، جیسا کہ ادب، مذہب، یا تاریخ میں ہوتا ہے۔ قدیم اشاروں میں وہ ادبی یا ثقافتی گہرائی موجود نہیں تھی جو تلمیح میں پائی جاتی ہے، لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ اشارے تلمیح جیسی ابتدائی شکلوں کا پیش خیمہ تھے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اشاروں میں گفتگو نے تلمیح جیسے ادبی تصورات کی بنیاد رکھی، جو بعد میں زبان، ادب، اور تہذیب کی ترقی کے ساتھ زیادہ پیچیدہ اور معیاری شکل اختیار کر گئے۔

رومن اور یونانی ادب میں تلمیح کا آغاز قدیم تہذیبوں کی طرح مذہبی، اساطیری، اور تاریخی روایات سے ہوا۔ ان تہذیبوں میں کہانیوں اور دیومالائی داستانوں کا ایک مضبوط پس منظر موجود تھا، جو لوگوں کی زندگی، مذہب، اور ثقافت میں گہرا اثر رکھتے تھے۔ یہی داستانیں اور اساطیری کردار ادبی تلمیح کی بنیاد بنے۔ یونانی ادب میں، تلمیح کی جڑیں ہومر کی مشہور رزمیہ نظموں "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" میں ملتی ہیں، جہاں مختلف دیوی دیوتاؤں،

جنگوں، اور تاریخی واقعات کے حوالے دیے گئے ہیں۔ ان نظموں میں ہومر نے یونانی دیومالائی کہانیوں اور مذہبی عقائد کو اپنے اشعار کے ذریعے زندہ رکھا۔ اساطیری کردار جیسے زیوس، ہیرا، ایتھینا، اور ہرکولیس یونانی ادب میں بار بار ظاہر ہوتے ہیں اور ان کا ذکر مختصر اشاروں کے ساتھ کیا جاتا ہے، جو تلمیح کی واضح مثالیں ہیں۔ ان اشاروں کو سمجھنے کے لیے قاری کو ان کہانیوں کا علم ہونا ضروری ہے۔ رومی ادب میں تلمیح کا آغاز یونانی اثرات کے تحت ہوا، کیونکہ رومی ثقافت اور ادب پر یونانی تہذیب کا گہرا اثر تھا۔ رومی شاعر ورجل (Virgil) نے اپنی مشہور رزمیہ نظم "انیڈ" میں رومی اساطیر اور تاریخ کی تلمیحات پیش کیں۔ اسی طرح، اووڈ (Ovid) کی نظم "میٹامورفوسس" دیومالائی کہانیوں کا ایک خزانہ ہے، جہاں انہوں نے اساطیری واقعات کو علامتی انداز میں بیان کیا۔

اردو ادب میں صنعتِ تلمیح کا آغاز فارسی ادب کے گہرے اثر کے تحت ہوا، کیونکہ اردو زبان کی تشکیل میں فارسی، عربی، اور مقامی زبانوں کا بڑا حصہ ہے۔ فارسی ادب میں صنعتِ تلمیح کو نمایاں مقام حاصل تھا، اور فارسی شعرا جیسے فردوسی، سعدی، حافظ، اور رومی نے قرآنی واقعات، اسلامی تاریخ، اور اساطیری کہانیوں کی طرف اشارے کر کے اپنے کلام کو گہرائی بخشی۔ یہی روایت اردو ادب میں منتقل ہوئی، اردو شاعری میں تلمیح کی ابتدا دکن کے ابتدائی شعرا، جیسے قلی قطب شاہ اور ولی دکنی کے کلام سے نظر آتی ہے۔ ان شعرا نے اپنے اشعار میں اسلامی تاریخ، اور مشہور اساطیری داستانوں کی طرف اشارے کیے۔ ولی دکنی کو اردو شاعری کا پہلا شاعر کہا جاتا ہے، اور ان کے کلام میں فارسی ادب کے اثرات واضح ہیں۔ اردو ادب میں صنعتِ تلمیح اپنے عروج کو دہلی اور لکھنؤ کے کلاسیکی دور میں پہنچا۔ میر تقی میر اور مرزا غالب جیسے شعرا نے تلمیح کو نہایت خوبصورتی سے استعمال کیا۔ میر کے ہاں تاریخی اور مذہبی اشارے نہایت دلنشیں انداز میں ملتے ہیں، جب کہ غالب کے اشعار اسلامی تاریخ، اور اساطیری واقعات کی تلمیحات گہرے فکری اور فلسفیانہ پہلو رکھتی ہیں۔ اردو نثر نگاروں میں سر سید احمد خان، مولانا شبلی نعمانی، اور دیگر مصلحین نے تحریروں میں قرآنی آیات اور تاریخی واقعات کے اشارے دے کر اپنے دلائل کو مضبوط بنایا، یوں اردو ادب میں تلمیح کا آغاز فارسی ادب سے ہوا اور یہ رفتہ رفتہ اردو شاعری اور نثر کا ایک لازمی حصہ بن گئی۔ اس نے اردو ادب کو نہ صرف فکری گہرائی دی بلکہ قاری کے تخیل کو ماضی کے عظیم واقعات اور شخصیات سے جوڑنے کا ذریعہ بھی بنی۔

ڈاکٹر وزیر آغا اردو ادب میں شاعری، تنقید، تحقیق کے علاوہ انشائیوں کی وجہ سے مقبول ہیں۔ ان کی تخلیقات مدلل اور منطقی طریقہ کار پر مبنی ہیں۔ انہوں نے انشائیوں میں شخصی تلمیحات کے ذریعہ زندگی کے نئے تجربات بیان کیے ہیں۔ ان کی تحریروں میں تلمیحات عام طور پر مذہبی، تاریخی، ادبی، اور اساطیری حوالوں پر مبنی ہوتی ہیں، جن کے ذریعے وہ اپنے خیالات کو نہ صرف مضبوط بناتے ہیں بلکہ قاری کے لیے دلچسپی اور معنویت کا سامان بھی پیدا کرتے ہیں۔ انہوں نے ان تلمیحات کو بطور علامت بھی استعمال کیا ہے، ان علامتوں کے پردے میں وہ زندگی کی نئی روشنیوں کی بات کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں فارسی اور اردو کلاسیکی ادب کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ غالب، میر، اقبال، اور دیگر شعرا کے اشعار اور خیالات کی تلمیحات ان کی تحریروں میں جابجا دکھائی دیتی ہیں۔ یہ تلمیحات نہ صرف ان کے خیالات کو وسعت دیتی ہیں بلکہ قاری کو ادبی میراث کے ساتھ جوڑتی ہیں **خیال پارے** ان کے انشائیوں پر مشتمل کتاب ہے جن میں "خیال پارے"، "چوری سے یاری تک"، "دوسرا کنارہ"، "سمندر اگر میرے اندر گرے" شامل ہیں۔ "سمندر اگر میرے اندر گرے" کے بعد میں شخصی تلمیحات کے حوالے سے بھرپور فکری نظام موجود ہے۔

ان کے انشائیوں میں اشخاص کی تلمیحات بیشتر انسانی عظمت، زندگی اور ان سے وابستہ مسائل کے ساتھ نبرد آزمائی کے لیے ہیں، جیسے آدم علیہ السلام کی جانب اشارہ اس انداز میں کرتے ہیں:

"آپ گویا پہلے انسان ہیں جو ملاء اعلیٰ سے جھگڑ کر فرشتہ پن سے مایوس ہو کر اس خطۂ ارضی پر آئے ہیں اور آپ کے سامنے کوئی منزل ہے نہ نشان(2) "!

اس تلمیح میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور وجہ تخلیق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے چند سطروں میں انسانی فطرت و عظمت کی پوری تاریخ لکھ دی۔ اس کے ساتھ ان کے نزدیک انسان جب ایک قانون کے تابع رہتا ہے اور ایک مدار میں زندگی بسر کرتا ہے تو اس کی زندگی میں لغزشوں کا امکان مفقود رہتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حوا کی تلمیح وہ یوں استعمال کرتے ہیں:

"آدم کی نظریں بے خیالی میں حوا کی جانب اٹھتی ہیں، جو ایک نازک سی شاخ کی طرف اپنے ہی بوجھ سے جھکی ہوئی، کوئی سنگ ریزہ اٹھانے کی کوشش میں ہے۔۔۔(3) "

ڈاکٹر وزیر آغا نے تلمیح کے تناظر میں انسان کی فطرت کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ حوا کا حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھ کر نظریں جھکانا اسلامی اصولوں کی روشنی میں عورت کے حیا کا تصور ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تلمیح انہوں نے "پگڈنڈی" میں شامل انشائیہ "عریانی" میں بھی دی ہے:

"انہوں نے انجیر کے بڑے بڑے پتوں سے جسم کو چھپانے کی کوشش کی تو ایک تیز دھار احساسِ برہنگی نے انہیں فی الفور ڈس لیا(4) "

اس تلمیح میں انہوں نے نہ صرف انسانی ارتقائی تہذیب و تمدن کو موضوع بنایا ہے بلکہ نفسیاتی پہلو کو بھی پیش کیا ہے، کس طرح انسان اپنی پیدائش کے بعد مختلف ارتقائی مراحل سے نکل کر جب تہذیب و تمدن کے دور میں آتا ہے تو لباس اسے نفسیاتی طور پر محفوظ ہونے کا احساس دلاتا ہے اور یہی لباس انسان کے تشخص کا اہم جزو بن جاتا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیوں میں شخصی تلمیحات کا تصور ان کے ذہنی مدارج کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ ایک تلمیح میں کسی بھی واقعہ یا منظر کی پوری تاریخ بیان کر جاتے ہیں۔ ان کے ہاں شخصی تلمیحات زیادہ تر ان انسانوں کی ہیں جنہوں نے زندگی میں حرکت کو قبول کیا ہو، سکوت میں ہنگامہ بپا کیا ہو۔ وہ زندگی کو عام ڈگر سے گزارنے والوں کی فکر کو ترجیح نہیں دیتے۔ روسو، جو فلسفی، مصنف، اور جدید سماجی نظریات کا اہم ستون تھا، وزیر آغا کے فکری افق پر ایک اہم حوالہ ہے۔ وزیر آغا انشائیہ نگاری میں روسو کا ذکر انسانی جبلت، فطرت سے قربت، اور سماجی جکڑبندیوں کے خلاف آزادی کی تلاش کو اجاگر کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں روسو کی فکر کو انسانی فطرت کی معصومیت اور سادگی کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ اکثر روسو کے مشہور قول **"انسان آزاد پیدا ہوا ہے، لیکن ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے "** کو ایک استعارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، جس کے ذریعے وہ جدید انسان کے سماجی مسائل اور زندگی کی پیچیدگیوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ روسو کا ذکر انشائیوں میں عام طور پر اس وقت آتا ہے جب وزیر آغا انسانی فطرت کے بگاڑ، مادیت پسندی، یا اخلاقی انحطاط پر گفتگو کرتے ہیں۔ وہ روسو کے نظریے کو بنیاد بنا کر فطرت کی طرف لوٹنے اور سادگی اپنانے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر، وزیر آغا فطرت کی خوبصورتی اور انسانی روح کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے روسو کی تحریروں کو حوالہ بناتے ہیں، تاکہ قاری کو یاد دلائیں کہ فطرت کے قریب رہنے سے انسان اپنی اصل کی طرف پلٹ سکتا ہے۔

وہ کہتا ہے انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن ہر جگہ وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے "۵

وہ روسو کے خیالات کو نہ صرف ایک فکری حوالے کے طور پر پیش کرتے ہیں بلکہ ان کے ذریعے قاری کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ سماجی پابندیوں سے آزاد ہو کر اپنی حقیقی ذات کو پہچانے اور فطرت سے ہم آہنگ زندگی گزارے۔ انشائیوں میں روسو کا ذکر وزیر آغا کی اس خاصیت کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ مغربی فلسفے کو اردو انشائیہ نگاری میں نہایت خوبصورتی سے شامل کر کے اس کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔ یہ جملہ "انسان آزاد پیدا ہوا، لیکن جہاں دیکھو زنجیروں میں قید ہے" ژاں ژاک روسو (Jean-Jacques Rousseau) کے فلسفے کی بنیاد ہے، جو ان کی کتاب "سوشل کانٹریکٹ (The Social Contract) " کے ابتدائی حصے میں بیان کیا گیا ہے۔ روسو کے نزدیک یہ جملہ انسانی فطرت اور سماجی نظام کے درمیان تضاد کو بیان کرتا ہے۔ روسو کا ماننا تھا کہ انسان اپنی فطرت میں آزاد اور خود مختار پیدا ہوتا ہے، لیکن جب وہ سماج کا حصہ بنتا ہے، تو مختلف قسم کی سماجی، معاشی، اور سیاسی جکڑ بندیوں میں پھنس جاتا ہے۔ یہ جکڑ بندیاں قانون، روایت، مذہب، اور معاشرتی توقعات کی شکل میں سامنے آتی ہیں، جو انسان کی فطری آزادی کو محدود کر دیتی ہیں۔ انسان اپنی اصل حالت میں آزاد اور مساوی تھا، اور وہ اپنی ضروریات کے لیے فطرت پر انحصار کرتا تھا۔ اس میں کوئی جبر، ملکیت، یا طاقت کا استعمال شامل نہیں تھا۔ **سماجی زنجیریں**: جب انسان نے سماج قائم کیا اور زمین، وسائل، اور دولت کی ملکیت کا تصور پیدا کیا، تو اس کے ساتھ طاقت، جبر، اور نابرابری بھی جنم لے لی۔ یوں انسان اپنی فطری آزادی کھو بیٹھا اور سماج کی زنجیروں میں جکڑ گیا۔

وزیر آغا جیسے ادیب اور انشائیہ نگار اس قول کو انسانی نفسیات، سماج، اور جدید دور کے مسائل کے تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ وزیر آغا کے انشائیوں میں اس قول کا ذکر انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی کشمکش کو واضح کرنے کے لیے آتا ہے۔ وہ دکھاتے ہیں کہ کس طرح جدید انسان مادی ترقی کے باوجود سماجی، ذہنی، اور جذباتی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ قول قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کہ وہ یہ سوچے کہ اس کی زندگی کے فیصلے اور ترجیحات کہاں تک اس کی اپنی ہیں اور کہاں تک وہ سماج کے جبر یا توقعات کے زیرِ اثر ہیں۔ وزیر آغا روسو کے اس تصور کو انسانی زندگی کی گہرائی اور پیچیدگی کو بیان کرنے کے لیے بطور استعارہ استعمال کرتے ہیں۔ انشائیہ **قطب مینار** میں وہ قبلائی خان کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

"مجھے قبلائی خان کی طرح اپنے بزرگوں کی پر اسرار آوازیں سنائی دیں۔۔۔

اے زود فراموش تو نے دلی پہنچ کر قطب مینار دیکھنے کا مصمم ارادہ کیا تھا(6) "

یہ اقتباس وزیر آغا کی انشائیہ نگاری کے تخلیقی اور تلمیحاتی انداز کی ایک عمدہ مثال ہے، جہاں وہ تاریخی، ادبی، اور جذباتی حوالوں کو ایک ساتھ مربوط کرتے ہیں۔ اس اقتباس میں دو اہم تلمیحات نمایاں ہیں: **قبلائی خان** منگول حکمران تھا جسے مشرقی دنیا میں ایک عظیم فاتح کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی شخصیت اور کارنامے تاریخ میں ایک پر اسرار اور رومانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ وزیر آغا نے اس تلمیح کو استعمال کرتے ہوئے اس کیفیت کو بیان کیا ہے جہاں انسان اپنے اندرونی خیالات، ماضی کی یادوں، یا خوابوں کی گونج سن کر حیران ہو جاتا ہے۔ یہ آوازیں انسان کے اندر کے تضادات، خواہشات، اور لاشعوری احساسات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ **قطب مینار** دہلی کی ایک اہم تاریخی یادگار ہے، جو طاقت، تعمیراتی عظمت، اور تاریخی تسلسل کی علامت ہے۔ وزیر آغا نے یہاں قطب مینار کو ایک ایسے خواب یا مقصد کے طور پر پیش کیا ہے،

جسے حاصل کرنے کی خواہش انسان اپنے دل میں رکھتا ہے، مگر وقت یا حالات کی گرد میں وہ اسے بھول جاتا ہے۔ **"اے زود فراموش "** کا خطاب اس بات کو اجاگر کرتا ہے کہ انسان اپنی منزل یا ارادے کو کتنی جلدی بھلا دیتا ہے اور زندگی کی الجھنوں میں کھو جاتا ہے۔ وہ ماضی اور حال، خواب اور حقیقت، اور تاریخ اور ذاتی تجربات کو یکجا کر کے قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ **قبلائی خان** اور **قطب مینار** کی تلمیحات اس بات کی یاد دہانی ہیں کہ زندگی میں بڑے مقاصد اور خوابوں کو یاد رکھنا اور ان کی سمت میں آگے بڑھنا ضروری ہے۔ قبلائی خان کی جانب ان کا اشارہ اس حوالے سے اہم ہے کہ ان کے نزدیک جہاں انہوں نے قدم رکھا وہ ناکام ہوئے اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ علم دوست ہونے کی وجہ سے ان کو جنگوں کی جانب نہیں جانا چاہئے تھا۔ **آئن سٹائن** کا ذکر انشائیہ **"وہ "** میں اس طرح کرتے ہیں.

"آئن سٹائن کے نظریہ اضافت کے غالباً یہ بیسویں صدی کی سب سے

بڑی دریافت ہے جس پر فخر کریں تو کم ہے"۷

ان کے انشائیوں میں شخصی تلمیحات زندگی میں نئے پن کی جانب اشارہ ہے کہ ایک ڈگر پر چلنے والے کبھی زندگی کے گوناگوں تجربات سے لطف اندوز نہیں ہوسکتے، سکوت فرد کے داخلی و خارجی افکار کو ایک دائرے میں بند کر دیتا ہے۔ **"وہ "** کا اشارہ آئن سٹائن کی جانب ان کے نظریاتی و فکری جدت کے لیے کیا گیا ہے۔ **ارشمیدس** (۲۸۷تا۲۱۲ق.م) یونانی موجد تھا، ماہر ریاضیات تھا، وہ اپنی دریافت پر "یوریکا! یوریکا!" کا نعرہ لگاتا۔ وزیر آغا ان کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں

"میں ارشمیدس کی تقلید میں یوریکا یوریکا نعرہ بلند کرتے ہوئے باہر کو لپکا

لیکن دروازے تک پہنچ کر رک گیا باہر شدید سردی تھی اور کمرہ گرم ہو رہا تھا

اور ارشمیدس کو گزرے صدیاں گزر چکی تھیں"۸

ارشمیدس بھی زندگی میں نئی دریافت پر یقین رکھتا ہے وہ بھی زندگی کے معنی سے مفہوم کو وسعت دیتا تھا اور خود مصنف جب نئے معنی دریافت کرتا یا زندگی کے وسائل میں ایک نیا وسیلہ سامنے آتا تو ان کی طرح جشن مناتے، ارشمیدس کو گزرے صدیاں ہو چکی ہیں البتہ ان کی جدت اور دریافت کی فکری جہت آج بھی زندگی کے رکے تالاب میں کنکر ڈال رہی ہے، عظیم انسان ہر زمانے کے ساتھ جیتے ہیں۔ انشائیہ "وہ" میں وہ "ابلیس" کا ذکر اس طرح کرتے ہیں

"زندگی بحیثیت یکایک مجموعی بے حد سادہ تھی یک رنگ اور سپاٹ تھی۔۔

۔اور پھر یکایک وہ تیسری حقیقت عالم وجود میں آئی جیسے آپ شاید ابلیس کا نام دیں۔۔۔

ابلیس نے آتے ہی بجھتی ہوئی چنگاری کو ہوا دی"۹

ابلیس کا وجود کائنات میں شر کی علامت ہے البتہ اس کے وجود سے کائنات میں لگاتار خیر و شر کا ہنگامہ بپا ہے وہ **مسلسل** حرکت میں ہے اس کو اپنے انجام کا بھی علم ہے البتہ وہ زندگی میں چلنے والے اس ہنگامہ کا بڑا کردار ضرور ہے یوں اس کی تخلیق کائنات میں ایک چنگاری جیسی ہے جو ہر جانب حرکت کے فلسفہ پر عمل پیرا ہے رام اور سیتا کی تلمیح اس طرح استعمال کرتے ہیں

"رام سیتا کی محبت میں بیاہتا محبت تھی۔۔۔اصل قصہ تو اس وقت شروع ہوا

جب راون نے بیاہی ہوئی سیتا سے محبت کی اور اسے اغوا کر لیا"١٠

رام اور سیتا **رامائن** سے ماخوذ ہے، رزمیہ صنف کی ایک طویل کہانی ہے، دونوں کی محبت میں اصل ہنگامہ رقیب کے بعد آتا ہے، گویا وہ تمام کردار جو زندگی کے واقعات میں تحریک بھرتے ہیں، ان کے نزدیک زندگی کے دائرے کو سکوت سے نکالتے ہیں۔ اگرچہ تیسرا فریق بھی محبت میں منفی کردار ہے، تاہم اس کے پاس کرنے اور واقعات کو بدلنے کا ہنر ہے، وہ سکوت میں شور پیدا کر سکتا ہے۔ **سکندرِ اعظم** کا انشائیہ **"معافی مانگنا "** میں سکندر کی شخصیت کا ایک نیا پہلو سامنے لاتے ہیں۔

"اصل بات یہ ہے کہ پورس نے معافی مانگ کر سکندر کی بھاری کم شخصیت کو تار تار کر دیا تھا"١١

یہ جملہ تاریخ کے دو عظیم شخصیات، پورس اور سکندرِ اعظم کے مابین ہونے والے مشہور معرکے اور ان کے بعد کے واقعات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ واقعہ سکندر کی ہندوستانی مہم کے دوران پیش آیا، جب اس کا سامنا راجا پورس سے ہوا، جو ایک بہادر اور عزت دار حکمران کے طور پر جانا جاتا ہے۔ تاریخ میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب پورس شکست کھانے کے بعد سکندر کے سامنے پیش ہوا، تو سکندر نے اس سے پوچھا کہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے۔ پورس نے بے خوفی اور وقار سے جواب دیا، **"ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے ساتھ جیسا سلوک کرتا ہے"**۔ یہ جواب پورس کی عظمت اور خودداری کی علامت تھا، جس نے سکندر کو متاثر کیا۔ سکندر نے نہ صرف اسے معاف کیا بلکہ اس کی ریاست بھی اسے واپس کر دی۔

تاہم، یہاں ذکر کردہ جملہ ایک مختلف تشریح پیش کرتا ہے، جو پورس کے کردار کو کمزور اور سکندر کی شخصیت کو متاثر کرنے کے طور پر دکھاتی ہے۔ یہ ممکنہ طور پر ایک تخلیقی یا طنزیہ انداز میں لکھا گیا جملہ ہے، جو تاریخی حقیقت سے مختلف ہے۔ حقیقت میں، پورس نے سکندر کے سامنے معافی نہیں مانگی تھی بلکہ اپنی بہادری اور خودداری کے باعث سکندر کا احترام حاصل کیا۔ اگر پورس معافی مانگ کر اپنی عزتِ نفس کو مجروح کرتا، تو یہ سکندر کی نظر میں اس کی شخصیت کو کمزور کر سکتا تھا، لیکن تاریخ کے معتبر حوالوں میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

یہ جملہ اس بات کو اجاگر کرتا ہے کہ معافی یا عاجزی کا غلط استعمال کسی کی شخصیت کو کمزور کر سکتا ہے، جبکہ عزتِ نفس اور وقار انسان کی شخصیت کو بلند کرتے ہیں، جیسا کہ حقیقی واقعے میں پورس کے رویے نے کیا۔

انشائیہ **"کھڑکی "** میں **گوئٹے** کا ذکر نئی روشنی کی طلب کے لیے ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں میں شخصی تلمیحات ایسے علامتوں کے روپ میں ہیں جو زندگی کی وسعت میں مزید وسعتیں بھرتے ہوں۔ نئی روشنی کی طلب، زندگی کے نئے انداز کو اور زندگی کی محبت کو سامنے لاتی ہے۔ **ہٹلر یا قیصر** ("کچھ مسکراہٹ کے بارے میں") کا ذکر اُن لوگوں کے لیے ہوتا ہے جو زندگی کو ایک زاویے سے دیکھتے ہیں، کسی بھی نئے پہلو کو اپناتے

نہیں، اور ایک ہی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ **نطشے** کا حوالہ جدوجہد کے لیے ہے، جبکہ **اسلامی تلمیحات** جیسے حضرت **یوسف علیہ السلام** کا حوالہ، زندگی کے مسائل کو برداشت کرنے کے لیے ہے۔

"افلاطون نے اعیان کا جو فلسفہ نظریہ پیش کیا اس میں تمثیل غلاموں

کی حالت زار سے اخذ کی"۱۲

افلاطون کا اعیان کا نظریہ اس کے فلسفیانہ نظام کا بنیادی حصہ ہے، جس کے ذریعے وہ حقیقی حقیقت اور ظاہری دنیا کے درمیان فرق بیان کرتا ہے۔ یہ نظریہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ ہماری محسوسات کی دنیا، جسے ہم دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، حقیقی حقیقت کا صرف ایک عکس یا سایہ ہے، جب کہ حقیقی حقیقت غیر مادی اور ابدی اعیان کی دنیا میں موجود ہے۔ افلاطون نے اپنے اس نظریے کو سمجھانے کے لیے کئی تمثیلیں استعمال کیں، جن میں سب سے مشہور **غار کی تمثیل** ہے۔ یہ تمثیل غلاموں کے ذریعے انسانی جمود اور فکری قید کو ظاہر کرتی ہے۔ اس تمثیل میں افلاطون ایک غار کی تصویر کشی کرتا ہے جہاں غلام زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور غار کی دیوار پر صرف سائے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ سائے ان کے لیے حقیقت کی نمائندگی کرتے ہیں، حالانکہ اصل حقیقت غار سے باہر موجود روشنی اور اشیاء میں ہے۔ یہ تمثیل اعیان کے نظریے کی وضاحت کرتی ہے کہ ہماری محسوساتی دنیا حقیقی حقیقت نہیں بلکہ اس کا محض ایک عکس ہے۔ غلام، جو سائے کو حقیقت سمجھتے ہیں، ان انسانوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو علم کی کمی اور محدود سوچ کے باعث حقیقت کو نہیں پہچان پاتے۔ جب ایک غلام زنجیروں سے آزاد ہوتا ہے اور غار سے باہر نکل کر روشنی اور حقیقی دنیا کو دیکھتا ہے، تو یہ اس عمل کی علامت ہے جسے افلاطون علم، فکری آزادی، اور حقیقت کے ادراک کے حصول کے طور پر بیان کرتا ہے۔ ان کے انشائیوں میں تمثیل سے یہ سمجھانا تھا کہ ظاہری دنیا کے پیچھے ایک ابدی اور غیر مادی حقیقت موجود ہے، جسے صرف فکری جستجو، فلسفہ، اور علم کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ نظریہ انسانوں کو اپنے فکری اور روحانی دائرے کو وسیع کرنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ وہ ظاہری حقیقت کے پردے کو چاک کر کے حقیقی حقیقت تک پہنچ سکیں۔

یوں دیکھا جائے تو ان کے انشائیوں میں شخصی تلمیحات کا ذکر لگے بندھے روایتی انداز میں نہیں ہوتا بلکہ وہ زندگی کے نئے تجربات کے لیے کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصل زندگی سکوت میں نہیں بلکہ نئے تجربات میں ہے۔ وزیر آغا کے انشائیوں میں شخصی تلمیحات کا استعمال نہایت تخلیقی اور غیر روایتی انداز میں ہوتا ہے۔ وہ ان تلمیحات کو صرف ماضی کی شخصیات کی تعریف یا حوالہ دینے تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ ان کا مقصد زندگی کے نئے تجربات کو اجاگر کرنا اور ان کے ذریعے زندگی کی گہرائی اور معنویت کو سمجھنا ہوتا ہے۔

انشائیے میں اس تلمیح کو دوسرے زاویے سے دیکھے تو ان کے نزدیک عظیم لوگوں کی غلامی بھی منفرد ہوتی ہے یہ بات افلاطون، سقراط، اور ارسطو کے فکری سلسلے اور ان کے اثرات کو سمجھنے کے لیے نہایت اہم ہے۔ افلاطون نے سقراط کی فکر اور فلسفے کو اپنایا اور اسے اپنے منفرد انداز میں ترتیب دیا، جبکہ ارسطو نے افلاطون کے فلسفے کو بنیاد بنا کر اپنی آزادانہ فکر کی تشکیل کی۔ اگرچہ بظاہر یہ ایک قسم کی "غلامی" یا فکری وابستگی لگ سکتی ہے، لیکن یہ حقیقت میں علم کی جستجو اور اس کی عظمت کو تسلیم کرنے کا عمل ہے۔ علم کی "غلامی" کو فرد کی جیت اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ انسان کو جمود سے نکال کر فکری آزادی، سوالات کی جستجو، اور حقیقت کی تلاش میں لگاتی ہے۔ جب کوئی فرد کسی استاد یا فلسفے کی فکر کو اپناتا ہے، تو وہ

درحقیقت خود کو محدود کرنے کے بجائے علم کے ایک وسیع دائرے میں داخل ہو رہا ہوتا ہے۔ اس عمل سے صرف فرد ہی نہیں بلکہ پورا سماج مستفید ہوتا ہے۔ وہ انشائیہ نروان میں ابن عربی اور مولانا روم کا ذکر اس طرح کرتے ہیں

"ابن عربی دنیائے تصوف اور عالم معرفت کے گوہر۔۔۔ علامہ اقبال نے مولانا رومی کو اپنا پیر و رومی کہہ کر مخاطب کیا"۱۳

ابن عربی اور مولانا رومی دونوں اسلامی تصوف اور فلسفے کی دنیا کے درخشاں ستارے ہیں، جنہوں نے روحانی معرفت اور فکر پر گہرے نقوش چھوڑے۔ ابن عربی کو "عالمِ معرفت کے گوہر" کہنا ان کی گہری فکری اور روحانی بصیرت کا اعتراف ہے۔ ان کا نظریۂ وحدت الوجود، جس کے مطابق تمام کائنات یک ہی حقیقت کی عکاس ہے، انسان کو خودی اور الٰہی حقیقت کے تعلق کو سمجھنے کی دعوت دیتا ہے۔ ان کی تحریریں، جیسے عالمِ معرفت میں انسان کے مقام اور خدا کے ساتھ تعلق کی گہرائی کو بیان کرتی ہیں۔ مولانا رومی کو علامہ اقبال کا استاد کہنا اقبال کے فکری اور روحانی سفر کی وضاحت کرتا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری اور فلسفے میں مولانا رومی کو ایک رہنما کی حیثیت سے پیش کیا۔ اقبال نے رومی کے عشقِ حقیقی، خودی، اور حرکت و ترقی کے فلسفے کو اپنایا اور اپنی فکر کو ان کے نظریات کی روشنی میں پروان چڑھایا۔ رومی کے مشہور اشعار اور مثنوی اقبال کے لیے الہامی سرچشمہ ثابت ہوئے، جنہوں نے ان کے تصورِ خودی اور مسلم اُمّہ کی بیداری کے خواب کو شکل دی۔ یہ دونوں عظیم ہستیاں اپنی روحانی گہرائی اور فکری وسعت کے ذریعے نہ صرف اپنی قوموں بلکہ پوری دنیا کے لیے روشنی کا مینار بنیں۔ ابن عربی کی معرفت کے گوہر اور مولانا رومی کے عشقِ حقیقی نے علامہ اقبال جیسے مفکرین کو متاثر کیا، جنہوں نے ان کے افکار کو اپنے فلسفے اور شاعری میں ضم کر کے ان کو نئی بلندیوں تک پہنچایا۔

وزیر آغا کے نزدیک اصل زندگی سکوت یا جمود میں نہیں بلکہ حرکت، جستجو، اور نئے تجربات کی جست میں ہے۔ یہی فلسفہ ان کی انشائیہ نگاری میں بھی جھلکتا ہے، جہاں وہ تاریخ، فلسفے، اور ادب کی عظیم شخصیات کو اپنی زندگی اور مشاہدات کے تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ وہ ان شخصیات کو جامد تاریخ کے مجسمے کے طور پر نہیں بلکہ زندہ تجربات اور خیالات کے طور پر دیکھتے ہیں جو آج کے انسان کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر، وزیر آغا سقراط یا ارسطو کی تلمیح کو صرف فلسفے کی تاریخ کا حصہ بیان نہیں کرتے، بلکہ ان کے خیالات کو زندگی کی جستجو اور نئے زاویے تلاش کرنے کے لیے بطور محرک پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ شخصیات ایک ایسے رویے کی نمائندگی کرتی ہیں جو انسان کو سکوت سے نکال کر عمل، سوچ، اور تخلیق کی دنیا میں داخل کرتا ہے۔ وزیر آغا کا یہ نظریہ ان کے انشائیوں کو منفرد بناتا ہے، کیونکہ وہ ماضی کی عظیم شخصیات کو ایک پل کے طور پر استعمال کرتے ہیں جو قاری کو ماضی سے حال اور حال سے مستقبل تک کا سفر کرنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ ان کے انشائیے زندگی کی نئی جہات کو دریافت کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور قاری کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ اصل معنویت زندگی کے مسلسل تجربات اور جستجو میں ہے، نہ کہ ماضی کے سکوت میں۔

حوالہ جات:

۱) بحوالہ شمیم نیازی خزانہ تلمیحات، س۔ن، ص۱۵

۲) ڈاکٹر وزیر آغا، پگڈنڈی کلیات،(انشائیوں کا مجموعہ)اظہار سنز اردو بازار لاہور س،ن ص ۳۰

۳) ڈاکٹر وزیر آغا، پگڈنڈی کلیات،(انشائیوں کا مجموعہ)اظہار سنز اردو بازار لاہور س،ن ص,۱۵۱

۴) ایضاص ۲۴۳

۵) عبدالوحید، عالمی شخصیات، انسائیکلوپیڈیا، مشتاق بک کارنر لاہور، ۲۰۱۴، ص ۳۴۱

۶) ڈاکٹر وزیر آغا، پگڈنڈی کلیات،(انشائیوں کا مجموعہ)اظہار سنز اردو بازار لاہور س،ن ص,۱۱۱

۷) ڈاکٹر وزیر آغا، پگڈنڈی کلیات،(انشائیوں کا مجموعہ)اظہار سنز اردو بازار لاہور س،ن ص,۱۱۲

۸) ڈاکٹر وزیر آغا، پگڈنڈی کلیات،(انشائیوں کا مجموعہ)اظہار سنز اردو بازار لاہور س،ن ص ۱۱۲

۹) ڈاکٹر وزیر آغا، پگڈنڈی کلیات،(انشائیوں کا مجموعہ)اظہار سنز اردو بازار لاہور س،ن ص ۱۱۳

۱۰) ڈاکٹر وزیر آغا، پگڈنڈی کلیات،(انشائیوں کا مجموعہ)اظہار سنز اردو بازار لاہور س،ن ص ۲۶۰

۱۱) ڈاکٹر وزیر آغا، پگڈنڈی کلیات،(انشائیوں کا مجموعہ)اظہار سنز اردو بازار لاہور س،ن ص ۲۱۳

۱۲) ڈاکٹر وزیر آغا، پگڈنڈی کلیات،(انشائیوں کا مجموعہ)اظہار سنز اردو بازار لاہور س،ن ص ۲۹۱

۱۳) ڈاکٹر وزیر آغا، پگڈنڈی کلیات،(انشائیوں کا مجموعہ)اظہار سنز اردو بازار لاہور س،ن ص ۳۲۳